کہاں جائے گی تنہائی ہماری

کاشف حسین غائر

SCHEHERZADE

Kahan Jay Gi Tanhai Hamari
by *Kashif Hussain Ghyre*
E-mail: k.hghyre@yahoo.com

شعری مجموعہ	کہاں جائے گی تنہائی ہماری
شاعر	کاشف حسین غائرؔ
ترتیب وتدوین	سلمان خواجہ، حارث حسان
تزئین	حبیب الرحمٰن اعوان
اشاعت	دوہزار سترہ
تعداد	پانچ سو
قیمت	تین سو پچاس روپے
طباعت	اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

SCHEHERZADE

بی۔۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

انتساب

کوثر کاشف

حورین بانو

اور

سید محمد حسین کے لیے

فہرست

عقیدت.. ۸

◈ .....حمدِ باری تعالیٰ.. ۹

◈ .....نعتِ رسولِ مقبول ﷺ.. ۱۱

◈ .....سلام.. ۱۳

☆ .....غیر متوقع کا متلاشی   شمیم حنفی.. ۱۵

غزلیں

◈ .....جو اشک بچ گئے اُنھیں لاتا ہوں کام میں.. ۲۰

◈ .....یہ مسافت نہیں آسان، کہاں جاتا ہے؟.. ۲۱

◈ .....اک دن دُکھ کی شدت کم پڑ جاتی ہے.. ۲۳

◈ .....نظر ملی تو نظاروں میں بانٹ دی میں نے.. ۲۵

◈ .....صبح پھر چھوڑ کے جانے کو تھی اک بار مجھے.. ۲۶

◈ .....فراغتوں کو بھی مصروفِ کار لایا ہوں.. ۲۸

◈ .....دل ہے مامور ترے غم کی نگہبانی پر.. ۳۰

◈ .....احوال پوچھیے مرا، آزار جانیے.. ۳۲

◈ .....تھا بہت شور یہاں ایک زمانے میں مرا.. ۳۴

◈ .....آب وہوائے دشت نے مجھ کو طلب کِیا.. ۳۶

◈ .....خیال وخواب میں آئے ہوئے سے لگتے ہیں.. ۳۷

◈ .....وہ ہنس رہا ہے اُسے دل دُکھانا آتا ہے.. ۳۹

◈ .....ورنہ یہ رنگ، یہ انداز کہاں ملتا ہے.. ۴۰

◈ .....ہماری بات کا اُلٹا اثر نہ پڑ جائے.. ۴۲

◈ .....دست بردار زندگی سے ہُوا.. ۴۴

◈ .....یہ سارا مسئلہ مری تشکیک سے اُٹھا.. ۴۶

◈ .....لذتِ آوارگی جاتی رہی.. ۴۷

◈ .....جو بھی اچھا بُرا اپنایا ہے.. ۴۹

◈ .....یقین کرو وہ تہہِ آب دیکھ سکتا ہے.. ۵۰

◈ .....کچھ دنوں ہی بے دلی دیوار تھی.. ۵۱

◈ .....عجب تحریک سی آنکھوں کو طغیانی سے ملتی ہے.. ۵۳

◈ .....وقت مزدور ہے، اُجرت دیجے.. ۵۴

◈ .....بزم سے دُور رکھا حلقۂ تنہائی نے.. ۵۶

◈ .....دو چار دن میں غم کو ٹھکانے لگاؤں گا.. ۵۷

◈ .....سنہرا دن شبِ تاریک لگ رہا ہے مجھے.. ۵۹

◈ .....ٹھیک کہتے ہیں سبھی عشق پریشانی ہے.. ۶۱

◈ .....کسی کو کچھ، کسی کو کچھ بتاتے.. ۶۳

◈ .....کیسی راحت ہے یہ اک خواب سے عاری کے لیے.. ۶۵

◈ .....زمیں سے ختم پرندوں کی بے گھری کریں گے.. ۶۶

◈ .....ساتھ رہ کر بھی کوئی ساتھ کہاں دیتا ہے.. ۶۸

◈ .....خواب لپٹے ہیں عجب دیدۂ بیدار کے ساتھ.. ۷۰

◈ .....میں نہ پہنچا تو گھر گئے میرے.. ۷۲

◈ .....ہوا کا خوف، اندھیرے کا ڈر بھی رہتا ہے.. ۷۴

◈ .....دروازے کو دستک زندہ رکھتی ہے.. ۷۶

◈ .....ہر ایک منظر جاں کو بجھا کے رکھ دیا ہے.. ۷۸

◈ ....خوش بہت غم زدوں میں رہتا ہوں ۸۰
◈ ....کون تھا، جس نے اُداسی کی پذیرائی کی ۸۲
◈ ....سُن کر میری کہانی کو ۸۴
◈ ....یاد وہ سانحہ کیسے جائیں ۸۶
◈ ....دشت نے اُس سے رعایت نہیں کی ۸۸
◈ ....وجود اپنا برائے عدم بناتا ہوں ۸۹
◈ ....محبت اک انوکھا واقعہ ہے ۹۱
◈ ....ورنہ اس شہر میں رہتا ہے کوئی کیا آباد ۹۳
◈ ....اِک گھر میں مقیّد ہوا، اِک گھر سے نکل کر ۹۵
◈ ....غم ایک طرف رکھ جو زمانے سے ملا ہے ۹۷
◈ ....ہر گام بدلتے رہے منظر مرے آگے ۹۹
◈ ....دل میں تیری محبت بڑھتی جاتی ہے ۱۰۱
◈ ....عمر بھر عشق کا پردہ رکھا ۱۰۲
◈ ....وہ ایک رات ہَوا کی جو داستاں سنتے ۱۰۴
◈ ....فیصلہ ہاں نہیں پہ چھوڑ گیا ۱۰۶
◈ ....ملال کرتے رہے وقت کے گزرنے کا ۱۰۸
◈ ....اب یہ عالم ہے کہ تصویر اسے تکتی ہے ۱۰۹
◈ ....کسی کو تیرے سوا یاد کیوں نہیں کرتا ۱۱۰
◈ ....یہ جہاں تک راستہ موجود ہے ۱۱۲
◈ ....مری طرح کوئی برباد ہونے والا نہیں ۱۱۴
◈ ....کوئی تو بات ہوگی رفتگاں میں ۱۱۶
◈ ....میری آوارگی واقعہ بن گئی ۱۱۸
◈ ....خواب وخواہش سے بھر دیا ہے مجھے ۱۲۰
◈ ....پھر وہی کچھ یہاں دکھائی دیا ۱۲۲
◈ ....وقت سے جان چھڑا لی میں نے ۱۲۴
◈ ....یہ رتجگوں کا سفر اب تمام کرتا ہوں ۱۲۶
◈ ....ایک سے ایک پریشانی سے ۱۲۷
◈ ....عشق پر ایمان کتنے دن رہا ۱۲۹
◈ ....گزری ہے عجب عشق کا معیار بناتے ۱۳۰
◈ ....دیکھنے والوں کو مشکل سے نظر آتا ہوں ۱۳۲
◈ ....مجھ سے کیسے چھپا لیا ہے مجھے ۱۳۳
◈ ....گزشتگاں میں ہمارا شمار ہونے میں ۱۳۵
◈ ....مشکل تھا جو بھی کام وہ مشکل نہیں رہا ۱۳۷
◈ ....تیرا خیال، تیری تمنا تک آ گیا ۱۳۹
◈ ....ہَوا کا رنگ سرِ رہ گزار ایسا ہُوا ۱۴۱
◈ ....خوشی کشید کرے دل غمِ جدائی سے ۱۴۳
◈ ....جنوں کی ناز برداری میں خوش ہے ۱۴۵
◈ ....بُلا رہا ہے مجھے رہ گزار اپنی طرف ۱۴۶
◈ ....بچھڑنے والوں کا کیونکر نہ غم کِیا جائے ۱۴۸
◈ ....کب اُسے دیکھتے نگاہ بھری ۱۵۰
◈ ....اب راستے میں سوچ رہے ہیں حضور کیا ۱۵۲
◈ ....ہماری صبح کسی شام سے نہیں ملتی ۱۵۴

☆ ....کاشف حسین غائر کی شاعری — سرور الہدیٰ ۱۵۵

عقیدت

آخرت میں نجات کو میری
ایک حمد، ایک نعت کافی ہے

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

O

خالی رہ جائے کیسے جام مرا
تیرے ذمّے ہے انتظام مرا

کاش! چُن لے تُو حاضری کے لیے
اِتنے ناموں میں ایک نام مرا

جو ترے ذکر سے مہکتی ہیں
اُن فضاؤں میں ہو قیام مرا

تجھ سِوا دوسرا نہیں کوئی
دھیان رکھے جو صبح و شام مرا

ربِ کعبہ تُو ہی نماز مری
ربِ کعبہ تُو ہی سلام مرا

وہ تو دل میں مرے مقیم ہے تُو
ورنہ میں کیا ہوں، کیا مقام مرا

حضورؐ! آپؐ کی آمد تھی، آپؐ کی آمد!
یہ کائنات عجب انتظار سے گزری

O

جو بات دل میں ہے میرے وہ بات ہوجائے
غزل تو ہوتی ہی رہتی ہے، نعت ہوجائے

پھر اس کے بعد تو ہر دن مرا مثالی ہو
بسر مدینے میں جو ایک رات ہوجائے

پُلِ صراط سے جس وقت ہو گزر میرا
حضورؐ ! آپ کی رحمت کا ساتھ ہو جائے

اُنہی کے ذکر سے اِس کو ثبات ہے ورنہ
یہ کائنات ابھی بے ثبات ہو جائے

درود پڑھیے کہ غائر یہ وہ عبادت ہے
شریک جس میں خدا کی بھی ذات ہو جائے

نام کاشفؔ حسین یونہی نہیں
میں حقیقت میں ہوں غلامِ حسینؑ

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

O

زمینِ قلب نم کرنے کے دن ہیں
یہ دن، نوحہ رقم کرنے کے دن ہیں

بکھرنا ہے غمِ ابنِ علیؑ میں
کہاں خود کو بہم کرنے کے دن ہیں

کِیا صرفِ نظر میں نے خوشی سے
کہ یہ دن، اُن کا غم کرنے کے دن ہیں

اُنھیؑ کا نام بس وردِ زباں ہے
زباں کو محترم کرنے کے دن ہیں

مرے پیشِ نظر اُنؑ کی رضا ہے
سرِ تسلیم خم کرنے کے دن ہیں

مجھے شبیرؑ کا صدقہ عطا کر
خداوندا! کرم کرنے کے دن ہیں

O

بس عرش دیکھتا تھا مقدر حسینؑ کا
نیزے پہ جب بلند ہُوا سر حسینؑ کا

اندر سے ہل کے رہ گئی فوجِ یزید بھی
لشکر پہ بھاری پڑ گیا اصغرؑ حسینؑ کا

ایسی شکستِ فاش ہوئی ہے یزید کو
اب حشر تک رہے گا اسے ڈر حسینؑ کا

اے بے خبر! خبر ہے، سبھی کے حسینؑ ہیں
تُو کوئی بھی ہو خیر، ادب کر حسینؑ کا

صاحب، ہمارے گریے کو گریہ نہ جانیے
یہ ذکر ہو رہا ہے برابر حسینؑ کا

غائؔر پڑے رہو کہ درِ اہلِ بیت ہے
جنت کی سمت کھلتا ہے یہ در حسینؑ کا

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

غیر متوقع کا متلاشی

کاشف حسین غائر کی شاعری غیر متوقع کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔آج سے تقریباً پچاس باون برس پہلے،ظفر اقبال کی غزلوں سے تعارف کے ساتھ کچھ ایسا ہی تاثر قائم ہوا تھا۔کیسی امکانات سے بھری ہوئی صنف ہے۔

غالبؔ،اقبالؔ،یگانہؔ،فراقؔ سے لے کر ناصرؔ کاظمی،ظفرؔ اقبال،احمد مشتاقؔ تک، ہمارے غزل گویوں نے اِس پامال اور پژمردہ صنف کی سطح پر کیا کیا جادو جگائے ہیں،مگر روایت گزیدگی نے اِس صنف کا حال خراب بھی بہت کیا ہے۔ثروتؔ حسین کے بعد بس چار پانچ شاعر ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے اِس مقبولِ عام صنف کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے، ورنہ سچائی تو یہی ہے کہ گاہے گاہے کسی زرخیز زمین کی معجزہ کاری کے باعث،کبھی کسی ردیف کے سہارے،کبھی نئے لفظی مناسبات کی مدد سے،غزل کا کوئی غیر رسمی اور غیر معمولی شعر ظہور میں آ گیا تو آ گیا، ورنہ زیادہ تر وہی تھکا دینے والے مضامین اور وہی بے رنگ، بے مزہ قافیہ پیمائی۔صنف غزل کے اقتدار کا دور شاید ختم ہوا،اب اِس صنف کے پیروکاروں کو نظم کے نئے تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے،اکہرے پن سے بچنے کے لیے!

کاشف حسین غائر کے بہت سے شعروں نے مجھے حیران اور میرے وجدان کو سرشار کیا ہے۔ ہمارے یہاں بالعموم دو طرح کے غزل گو پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے بس دو چار یا دس بیس کمال کے شعر کہے ہیں، دوسرے وہ جو بجائے خود کمال کے غزل گو ہیں، یعنی کہ ایسے غزل کہنے والے جن کی حسیّت اِس صنف کی ہیئت اور مزاج اور آہنگ سے ایک فطری مناسب رکھتی ہے، جو بہ ظاہر کسی آورد کے بغیر انوکھا اور یاد رہ جانے والا مختلف اور غیر متوقع شعر کہہ جاتے ہیں۔ جن کا شعور قوتِ ایجاد سے مالا مال ہوتا ہے۔

شام ہوتے ہی کہاں جاتا ہوں، کیا بتلاؤں
آدمی ہو کے پریشان کہاں جاتا ہے

گزشتگاں میں ہمارا شمار ہونے میں
اب اور وقت ہے کتنا غبار ہونے میں

ہے ایک عمر کا حاصل ہماری بیکاری
گنوائیں کیوں اِسے مصروفِ کار ہونے میں

بستی میں اِک چراغ کے جلنے سے رات بھر
کیا کیا خلل پڑا ہے ستاروں کے کام میں

کاشفؔ حسین خوب ہی ہوتے ہیں اہلِ عشق
اِس پار بھی کھڑے ہوں تو اُس پار جانیے

میں نہ پہنچا تو گھر گئے میرے
رات، احباب ڈر گئے میرے

میں تو اپنی طرف گیا غائرؔ
کس طرف ہمسفر گئے میرے

غائرؔ میں کئی روز سے خاموش ہوں ایسا
گویا نظر آتے ہیں یہ پتھر مرے آگے

کیا خبر، کیا دکھائی دینے لگے
آئنے کو مری نظر سے نہ دیکھ

کچھ دنوں دل میں کیا رہا وہ غزال
ساری وحشت یہیں پہ چھوڑ گیا

اس محبت کا ہو انجام بہ خیر!
جس کا آغاز جدائی سے ہُوا

ہم نے پہنا ہی نہیں غم کا لباس
ہو گیا میلا یہ رکھا رکھا

اک صدا آتی ہے زنجیر سے گاہے گاہے
خود گرفتار ہے زنجیر بنانے والا

یہ دیکھتی ہی نہیں بولنے بھی لگتی ہے
اِسی لیے تو میں تصویر کم بناتا ہوں

مرے ہُنر سے بہت کینوس پریشاں ہے
میں جو بھی آنکھ بناتا ہوں، نم بناتا ہوں

ایسے شعر صرف بھول چوک میں، یا محض اتفاقاً نہیں کہے جاتے۔ ایسے شعر کہنے کے لیے حسیّت میں گہرائی، نظر میں تازہ کاری اور تخلیقی سرشت میں استحکام کا ہونا ضروری ہے۔ کاشف حسین غائرؔ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ شعر کہتے وقت ان کی تمام حسیں بیدار رہتی ہیں۔ وہ صرف شاعر نہیں ہیں۔ وہ مصور، مجسمہ ساز، قصہ گو، جادوگر، مغنّی ۔۔۔ کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ وہ صرف لفظوں سے نہیں کھیلتے اور صرف پرانی زمینوں میں نئے راستے تلاش نہیں کرتے۔ نئے راستے بناتے ہیں اور نت نئے، نامانوس اور اچنبھے میں ڈالنے والے تجربوں سے گزرتے ہیں۔ نئی دنیائیں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور نئے راگ الاپتے ہیں۔

مجرد، غیر مجرد، روایتی اور غیر روایتی، بصری اور سمعی، ایسی ہی تقسیم سے ان کی بصیرت اور ان کا شعری وجدان ماورا ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار اور کبھی کبھی تو پوری کی پوری غزلیں، ہمارے احساسات کو ہر طرف سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ہمیں ان سے حیرت کے ساتھ ساتھ، بصیرت اور انبساط کی ایک ہمہ گیر کیفیت پر مبنی تجربہ بھی ملتا ہے۔ تقلیدی مزاج رکھنے والے اور پختہ کار غزل گویوں کی اکثریت اِس دولت سے محروم رہ جاتی ہے۔

شمیم حنفی

دلی: ۲۰ نومبر ۲۰۱۶ء

غزلیں

زمیں آباد ہوتی جا رہی ہے
کہاں جائے گی تنہائی ہماری

O

جو اَشک بچ گئے انھیں لاتا ہوں کام میں
تھوڑی سی دھوپ روز ملاتا ہوں شام میں

بستی میں اِک چراغ کے جلنے سے رات بھر
کیا کیا خلل پڑا ہے ستاروں کے کام میں

اک شخص اپنی ذات کی تعمیر چھوڑ کر
مصروف آجکل ہے مرے انہدام میں

مجھ کو بھی اُس گلی میں محبت کسی سے تھی
اب نام کیا بتاؤں؟ رکھا کیا ہے نام میں!

کاشفؔ حسین دشت میں جتنے بھی دن رہا
بیٹھا نہیں غبار مرے احترام میں

O

یہ مسافت نہیں آسان، کہاں جاتا ہے؟
اور پھر بے سروسامان! کہاں جاتا ہے؟

لوگ اِس راہ سے عجلت میں گزر جاتے ہیں
بے چراغی کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے

آج کل خواب کے بارے میں ہے تشویش مجھے
آنکھ کھلتے ہی یہ مہمان کہاں جاتا ہے

ایک نادیدہ سی زنجیر لیے پھرتی ہے
اپنی مرضی سے یہ انسان کہاں جاتا ہے

شام ہوتے ہی کہاں جاتا ہوں، کیا بتلاؤں
آدمی ہو کے پریشان کہاں جاتا ہے

اُس طرف کوئی رفوگر ہے، نہ دشتِ وحشت
روز یہ چاک گریبان کہاں جاتا ہے

تُو کہ آیا تھا مری مشکلیں آساں کرنے
ہوگئیں مشکلیں آسان! کہاں جاتا ہے

کون دیکھے گا تجھے، کون دکھائی دے گا
ہوگیا شہر بیابان، کہاں جاتا ہے

خود بھی حیران ہوں میں اُس سے گلے ملتے وقت
میرے اندر کا یہ حیوان کہاں جاتا ہے

بھاگ سکتا ہے کہاں دل کی عدالت سے کوئی
ہے یہی حشر کا میدان، کہاں جاتا ہے

خوف آتا ہے در و بام کو کاشف غائرؔ
جانے اِس گھر کا نگہبان کہاں جاتا ہے

O

اِک دن دُکھ کی شدت کم پڑ جاتی ہے
کیسی بھی ہو وحشت کم پڑ جاتی ہے

زندہ رہنے کا نشّہ ہی ایسا ہے
جتنی بھی ہو مدّت کم پڑ جاتی ہے

اپنے آپ سے ملتا ہوں میں فرصت میں
اور پھر مجھ کو فرصت کم پڑ جاتی ہے

صحرا میں آنکلے تو معلوم ہُوا
تنہائی کو وسعت کم پڑ جاتی ہے

کچھ ایسی بھی دل کی باتیں ہوتی ہیں
جن باتوں کو خلوت کم پڑ جاتی ہے

اک دن یوں ہوتا ہے خوش رہتے رہتے
خوش رہنے کی عادت کم پڑ جاتی ہے

کاشف غائرؔ دل کا قرض چکانے میں
دنیا بھر کی دولت کم پڑ جاتی ہے

اِس شہرِ دلآویز میں تنہائی مرے ساتھ
اب یاد نہیں کون سی محفل سے لگی تھی

O

نظر ملی تو نظاروں میں بانٹ دی میں نے
یہ روشنی بھی ستاروں میں بانٹ دی میں نے

بس ایک شام بچی تھی تمھارے حصے کی
مگر وہ شام بھی یاروں میں بانٹ دی میں نے

جناب! قرض چکایا ہے یوں عناصر کا
کہ زندگی انھی چاروں میں بانٹ دی میں نے

پکارتے تھے برابر مجھے سفر کے لیے
متاعِ خواب، سواروں میں بانٹ دی میں نے

ہَوا مزاج تھا، کرتا بھی کیا سمندر کا
اک ایک لہر کناروں میں بانٹ دی میں نے

O

صبح پھر چھوڑ کے جانے کو تھی اک بار مجھے
اُس نے بر وقت کِیا خواب سے بیدار مجھے

ایک دیوار کو تصویر سمجھتا رہا میں
اور تصویر سمجھتی رہی دیوار مجھے

زندہ رہنے کے لیے زہر بھی کھالوں لیکن
وہ بتائے تو سہی زہر کی مقدار مجھے

میں تو اک عمر سے مصروف اِسی کام میں ہوں
جو سمجھتا ہے، سمجھتا رہے بیکار مجھے

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

کیا بتاؤں کہ عجب ہے مرا شوقِ تعمیر
جو شب و روز کیے جاتا ہے مسمار مجھے

مجھ میں اک جنگ ہے جاری جو مجھے جیتنی ہے
گو نظر آتے نہیں فتح کے آثار مجھے

میں تو چپ چاپ کہانی سے نکل جاؤں مگر
روک لیتا ہے ہمیشہ مرا کردار مجھے

زلزلے آتے رہے گھر نہیں چھوڑا لیکن
مشورہ دیتے رہے گو درو دیوار مجھے

میں کہ جس دن سے ہوا چھاؤں کا عادی غائرؔ
بس اسی دن سے ہے یہ دھوپ کا آزار مجھے

O

فراغتوں کو بھی مصروفِ کار لایا ہوں
بہار آئی نہیں ہے، بہار لایا ہوں

مجھے یقیں ہے خزاں ہاتھ مل رہی ہوگی
وہ پھول شاخِ سمن سے اُتار لایا ہوں

خبر بھی ہے تجھے اے خواب دیکھنے والی
میں تیرے واسطے کیا کچھ اُدھار لایا ہوں

خدا کرے نہ کوئی ان میں نامہ بر نکلے
کہ جو پرندے میں کر کے شکار لایا ہوں

مرے عزیز زمانہ رُکا ہُوا ہے جہاں
میں اس جگہ سے بھی خود کو گزار لایا ہوں

کچھ اِتنی سہل نہ تھی دشتِ جاں کی آرائش
کہاں کہاں سے اُٹھا کر میں خار لایا ہوں

میں کیا کروں مجھے چہرہ نہ مل سکا کوئی
سو آئینے کے مقابل غبار لایا ہوں

یہ میں ہی جانتا ہوں ناؤ ٹوٹنے کے بعد
میں کیسے خود کو سمندر کے پار لایا ہوں

تو اِس میں کون سا میں نے غلط کِیا غائرؔ
بروئے کار اگر اختیار لایا ہوں

O

دل ہے مامور ترے غم کی نگہبانی پر
کوئی مشکل نہ پڑے اب مری آسانی پر

میں اِدھر لکھتا، اُدھر مٹتا چلا جاتا تھا
پھر بھی کچھ سوچ کے میں لکھتا رہا پانی پر

اب وہ منظر ہی کہاں جو مجھے حیران کرے
میں تو حیران ہوں بس آپ کی حیرانی پر

اِن لکیروں میں تو احوال چھپا ہے میرا
یہ لکیریں جو پڑی ہیں مری پیشانی پر

دشت سے بھاگا ہُوا، رات کا ہوں جاگا ہُوا
تبصرہ کیا کروں اِس شہر کی ویرانی پر

راستہ وہ ہے کہ خود اپنا بھی چلنا مشکل
شکر کرتا ہوں میں اِس بے سروسامانی پر

جب تلک آنکھ میں آنسو تھے میں رویا غائرؔ
اب تو جی کھول کے ہنستا ہوں پریشانی پر

کھلی جو آنکھ تو کوئی مرے قریب نہ تھا
مگر یہ واقعہ میرے لیے عجیب نہ تھا

O

احوال پوچھیے مرا، آزار جانیے
زنجیر دیکھ کر نہ گرفتار جانیے

افسوس! جا چکا ہے، گھڑی دیکھنے کا وقت
اب دُھوپ ہی سے وقت کی رفتار جانیے

آساں نہیں ہے جاننا اِس شہر کا مزاج
سو بار دیکھیے اِسے، سو بار جانیے

ہنسیے جناب! دیر تک اب اپنے آپ پر
کس نے کہا تھا خود کو سمجھ دار جانیے

کچھ دیر بیٹھ جایئے دیوار کے قریب
دیوار ہی کو سایۂ دیوار جانیے

کیا! ربطِ خاص آپ کو کارِ جہاں سے ہے؟
اچھا، تو آپ بھی مجھے بیکار جانیے

کاشفؔ حسین خوب ہی ہوتے ہیں اہلِ عشق
اِس پار بھی کھڑے ہوں تو اُس پار جانیے

کیا خبر، کیا دکھائی دینے لگے
آئینے کو مری نظر سے نہ دیکھ

O

تھا بہت شور یہاں ایک زمانے میں مرا
اب کوئی عکس نہیں آئنہ خانے میں مرا

راہ سے آنکھ ملانے کا ہنر جان گیا
وقت تو صرف ہُوا خاک اُڑانے میں مرا

اپنی یکجائی سے، تنہائی سے پورا نہ ہُوا
جتنا نقصان ہُوا شہر بسانے میں مرا

جانتا ہوں کہ اُسے میری ضرورت ہی نہیں
ورنہ کیا جاتا بھلا لوٹ کے آنے میں مرا

داد کیا کیا نہ حریفوں سے مجھے ملتی رہی
ہاں مگر جی نہ لگا شعر سنانے میں مرا

کوئی تعزیر، کہ میں نے بھی محبت کی ہے
کچھ تو حصّہ ہے یہ تحریک چلانے میں مرا

اپنے کردار سے انصاف ِکیا ہے میں نے
اور کردار نہیں کوئی فسانے میں مرا

دنیا میں ایک دل ہی ہمارا وکیل تھا
کم بخت وہ بھی صلح صفائی میں پڑ گیا

O

آب و ہوائے دشت نے مجھ کو طلب کِیا
مجنوں نے میرا حال بتا کر غضب کِیا

محفل میں قصّہ گو کے علاوہ کوئی نہ تھا
آغاز اُس نے میری کہانی کا جب کِیا

اِس زندگی کے ہم سے تقاضے عجیب تھے
جو کچھ ہمارے بس میں نہیں تھا، وہ سب کِیا

بیکار ہی چلا ہے تو اسباب ڈھونڈنے
میں نے تو جو بھی کام کِیا، بے سبب کِیا

کاشفؔ حسین یار مکینوں کے ساتھ ساتھ
میں نے تو بام و در کا بھی دل سے اَدب کِیا

O

خیال و خواب میں آئے ہوئے سے لگتے ہیں
ہمیں یہ دن بھی بِتائے ہوئے سے لگتے ہیں

ترے حضور کھڑے ہیں جو سر جھکائے ہوئے
زمیں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے سے لگتے ہیں

دیے ہوں، پھول ہوں، بادل ہوں یا پرندے ہوں
یہ سب ہَوا کے ستائے ہوئے سے لگتے ہیں

ہمارے دل کی طرح شہر کے یہ رستے بھی
ہزار بھید چھپائے ہوئے سے لگتے ہیں

ہر ایک راہ نورد و شکستہ پا کے لیے
یہ پیڑ ہاتھ بڑھائے ہوئے سے لگتے ہیں

ہر آن رُونُما ہوتے یہ واقعے غاؔئر
ہمارا دھیان بٹائے ہوئے سے لگتے ہیں

اس محبت کا ہو انجام بخیر
جس کا آغاز جدائی سے ہُوا

O

وہ ہنس رہا ہے اُسے دل دکھانا آتا ہے
میں رو رہا ہوں مجھے مسکرانا آتا ہے

ہم ایسے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
ہمارے بعد، ہمارا زمانہ آتا ہے

نئے مکاں میں نئے خواب دیکھتے ہیں لوگ
ہمیں تو یاد وہی گھر پرانا آتا ہے

دیے جلاؤں گا یونہی میں صبح ہونے تک
وہ دل جلائے جسے دل جلانا آتا ہے

یہ بحرِ عشق ہے غاؔئر کوئی مذاق نہیں
وہی بچے گا جسے ڈوب جانا آتا ہے

O

ورنہ یہ رنگ، یہ انداز کہاں ملتا ہے
خامشی سے مرا اندازِ بیاں ملتا ہے

روز اِس شور سے اُکتا کے نکل پڑتا ہوں
لیکن آگے بھی کچھ ایسا ہی سماں ملتا ہے

مجھ سے بھی ملیے کہ ملنے میں قباحت کیسی
خشک مٹّی سے بھی تو آبِ رواں ملتا ہے

مل گیا آج زمیں پر تو ادب سے ملیے
ورنہ یہ سر تو سرِ نوکِ سناں ملتا ہے

جی میں آتا ہے سرِ راہ ٹھکانہ کر لوں
کتنی مشکل سے کرائے کا مکاں ملتا ہے

یہ سبھی رنگ ہیں میرے، مرے ہونے کی دلیل
ان ہی رنگوں میں مرا نام و نشاں ملتا ہے

ملتا رہتا ہوں کم و بیش میں اُس سے غائر
مجھ کو معلوم ہے کس وقت کہاں ملتا ہے

یہ دیکھنے کو جاتا ہوں اُس شہر بار بار
کس کس کو میری نقل مکانی کا دکھ ہُوا

○

ہماری بات کا اُلٹا اثر نہ پڑ جائے
یہ دل کا بوجھ کہیں جان پر نہ پڑ جائے

تمام رات سُلگتا ہوں اور سوچتا ہوں
کسی چراغ کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے

اِسی خیال سے زخموں کی رُونمائی نہ کی
کہ امتحاں میں کہیں چارہ گر نہ پڑ جائے

پھر اس کے بعد کہاں جائیں گے یہ سایہ پسند
اُدھر کی دھوپ کسی دن اِدھر نہ پڑ جائے

لگی تو ہے یہ برابر مرے تعاقب میں
گلے ہَوا کے کہیں یہ سفر نہ پڑ جائے

یہ دشتِ عشق ہے غائرؔ ذرا خیال رہے
تمھارا پاؤں کسی دن اِدھر نہ پڑ جائے

ہمارے دل میں جو اک بات تھی، نظر آئی
بجھا چراغ تو یہ روشنی نظر آئی

O

دست بردار زندگی سے ہُوا
اور یہ سودا مری خوشی سے ہُوا

آگہی بھی نہ کرسکی پورا
جتنا نقصان آگہی سے ہُوا

میں ہُوا بھی تو ایک دن روشن
اپنے اندر کی روشنی سے ہُوا

زندگی میں کسک ضروری تھی
یہ خلا پُر تری کمی سے ہُوا

دل طرفدارِ ہجر تھا ہی نہیں
اب ہُوا بھی تو بے دلی سے ہُوا

شور جتنا ہے کائنات میں شور
میرے اندر کی خامشی سے ہُوا

لوگ اپنا حساب کرتے رہے
صبح اپنے حساب سے آئی

O

یہ سارا مسئلہ مری تشکیک سے اُٹھا
اپنا بھی بوجھ مجھ سے کہاں ٹھیک سے اُٹھا

وہ حال تھا کہ بس مرا اُٹھنا محال تھا
لیکن پھر ایک خواب کی تحریک سے اُٹھا

کاندھوں پہ تیرے آبرومندی کا بوجھ ہے
یہ راہِ زندگی ہے قدم ٹھیک سے اُٹھا

کاشفؔ حسین خلق کے اُٹھنے کی دیر تھی
اک آفتاب گوشۂ تاریک سے اُٹھا

کاشفؔ حسین مجھ سے مجھے دُور لے گیا
کیا شور تھا کہ جو مرے نزدیک سے اُٹھا

O

لذتِ آوارگی جاتی رہی
جانے والی چیز تھی، جاتی رہی

پہلے مجھ کو بھیڑ میں گم کر دیا
پھر مجھے آواز دی جاتی رہی

ایک گھر تعمیر مجھ میں ہوگیا
اور میری بے گھری جاتی رہی

جس طرف کوئی نہ تھا، کچھ بھی نہ تھا
اُس طرف بھی روشنی جاتی رہی

لمحہ لمحہ دل اُدھر کھنچتا گیا
رفتہ رفتہ بے دلی جاتی رہی

وہ خوشی، کہتے ہیں جس کو زندگی
زندگی بھر قرض کی جاتی رہی

سننے والا کون تھا، کوئی نہیں
بات تو پھر بھی کہی جاتی رہی

جاتے جاتے رُک گیا کوئی، مگر
اُس مکاں تک وہ گلی جاتی رہی

میں گزرتا چلا گیا اور وقت
دیکھتا رہ گیا مری رفتار

O

جو بھی اچھا بُرا بنایا ہے
دوسروں سے جُدا بنایا ہے

جو بھی دیکھے گا، مجھ کو دیکھے گا
میں نے وہ آئنہ بنایا ہے

زندگی ہجر میں بسر کر کے
وقت کو کام کا بنایا ہے

کوئی آوارہ گرد ہی ہوگا
جس نے یہ راستہ بنایا ہے

دیکھ! اک سرپھرے نے وحشت میں
حال کیا دشت کا بنایا ہے

O

یقین کر وہ تہہِ آب دیکھ سکتا ہے
جو اپنے آپ کو غرقاب دیکھ سکتا ہے

یہ پہلی بار اُسے دیکھ کر یقیں آیا
کہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ سکتا ہے

اک آدھ ہی کوئی ہوگا یہاں ہزاروں میں
جو دوسروں کو ظفریاب دیکھ سکتا ہے

میں دیکھ سکتا ہوں آئینہ دیر تک لیکن
کہاں وہ میری تب و تاب دیکھ سکتا ہے

ہمیں ہرانے کی خواہش میں، ہارنے والا
ہماری جیت کے اَسباب دیکھ سکتا ہے

O

کچھ دنوں ہی بے دلی دیوار تھی
پھر وہی دل تھا، وہی دیوار تھی

میں کہ اپنے آپ سے ٹکرا گیا
ویسے تو اک اَور بھی دیوار تھی

لوگ اُس کے سائے میں بیٹھے تھے، اور
زندگی گرتی ہوئی دیوار تھی

روکے رکھے آشنائی نے قدم
سامنے اک اجنبی دیوار تھی

اوج پر تھی خواہشِ ترکِ سفر
پر، کسی کی ہمرہی دیوار تھی

گھر میں دونوں رات بھر لڑتے رہے
تھا پرانا در، نئی دیوار تھی

اس جگہ سے کیوں پلٹ جاتی ہے موج
اِس جگہ پر کیا کوئی دیوار تھی؟

ہاں مری پہلی محبت کی گواہ
اُس گلی کی آخری دیوار تھی

مہک رہا ہے ابھی تک تمھاری خوشبو سے
وہ باغ جس میں مرا اِنتظار تم نے کِیا

O

عجب تحریک سی آنکھوں کو طغیانی سے ملتی ہے
ذرا دیکھوں تو میں یہ موج کس پانی سے ملتی ہے

میں اِس خلوت کدے میں جانے کیا کچھ تج کے بیٹھا ہوں
جگہ اِس انجمن میں کوئی آسانی سے ملتی ہے؟

گماں اِس شہر پہ ہوتا ہے اب شہرِ خموشاں کا
نہ جانے کیسی آبادی ہے، ویرانی سے ملتی ہے

O

وقت مزدور ہے، اُجرت دیجے
ایک اک لمحے کی قیمت دیجے

مجھ سے یہ بوجھ نہیں اُٹھ سکتا
مشورہ کوئی مجھے مت دیجے

ہجر کی رات نہیں ڈھلنے کی
اب چراغوں کو اِجازت دیجے

کام کچھ دل کے ہیں، کچھ دنیا کے
اک ذرا سی مجھے مہلت دیجے

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

دل کو آباد ہی کرنا ہے اگر
وہی دیوار، وہی چھت دیجے

دل ہے، دنیا تو نہیں ہے کوئی
جتنی چاہے اِسے وسعت دیجے

خود بھی رکھ سکتا ہوں میں اپنا خیال
کیا کسی اَور کو زحمت دیجے

ہوا چلے تو پریشان ہونے لگتے ہیں
تو کیا درخت بھی ہلکان ہونے لگتے ہیں

وہ خستگی ہے کہ غائرؔ کسی کے آنے پر
یہ بام و در بھی پشیمان ہونے لگتے ہیں

O

بزم سے دُور رکھا حلقۂ تنہائی نے
مجھ کو آنے نہ دیا سطح پہ گہرائی نے

اب مرے خواب الگ ہیں مرے احباب الگ
اس طرح مجھ کو بکھیرا مری یکجائی نے

جانے کیا سانحہ گزرا کہ پرندے ہیں خموش
اور اک شور مچا رکھا ہے انگنائی نے

میری نادانی اُڑاتی ہے تمسخر میرا
کس جگہ لاکے ڈبویا مجھے دانائی نے

بول اُٹھا، بول اُٹھا شہرِ خموشاں غائرؔ
واہ! کیا کام کِیا ہے تری گویائی نے

O

دو چار دن میں غم کو ٹھکانے لگاؤں گا
اِس کام میں بھی کیا میں زمانے لگاؤں گا؟

میرے لیے یہ کارِ وصیّت بھی شغل ہے
اک بھیڑ سی میں اپنے سرہانے لگاؤں گا

جب تک مری نگاہ ہے اہداف کی طرف
بیٹھا میں ٹھیک ٹھیک نشانے لگاؤں گا

پھر یاد آرہا ہے وہ بھولا ہُوا مقام
چکّر وہاں کا تیرے بہانے لگاؤں گا

مجھ کو جناب دھوپ اور آندھی کا خوف کیا
آیا ہوں میں تو پیڑ لگانے، لگاؤں گا

غائزؔ یہ سرزمین بھی لاشوں سے بھر گئی
خیمہ کہاں پہ اب میں نہ جانے لگاؤں گا

کاشفؔ حسین دونوں طرف کی یہ خامشی
ترکِ تعلقات کا آغاز ہی تو ہے

O

سنہرا دن شبِ تاریک لگ رہا ہے مجھے
یہ میرا وہم ہے یا ٹھیک لگ رہا ہے مجھے

بہت ہی دور، بہت دور ہے تمھاری طرح
یہ آسمان جو نزدیک لگ رہا ہے مجھے

دیا جلا کے پریشان ہوگیا ہوں میں
یہ گھر تو اور بھی تاریک لگ رہا ہے مجھے

زمیں پہ شور مچاتا ہُوا یہ سنّاٹا
کسی خیال کی تحریک لگ رہا ہے مجھے

تمھارے طرزِ پذیرائی کا جواب نہیں
یہ میرا حق ہے مگر بھیک لگ رہا ہے مجھے

میں دیکھتا ہوں اِسے جتنے غور سے غائرؔ
یہ نکتہ اتنا ہی باریک لگ رہا ہے مجھے

O

ٹھیک کہتے ہیں سبھی، عشق پریشانی ہے
ہاں مگر، پہلے مجھے کون سی آسانی ہے

غیر ممکن ہوئی جاتی ہے دوانے کی شناخت
اِس قدر عام یہاں چاک گریبانی ہے

میری اِس بات کی تائید کرے گی دنیا
میں نے دنیا کی کوئی بات نہیں مانی ہے

وہ اندھیرا ہے میں خود کو بھی نظر آتا نہیں
تُو مجھے دیکھ رہا ہے، مجھے حیرانی ہے

عشق میں ہوتا ہے ہر کام ہی اُلٹا سیدھا
آسماں میں نے بچھایا ہے، زمیں تانی ہے

دھیان جاتا ہے برابر اُسی منظر کی طرف
یہ تصور اُسی تصویر کا زندانی ہے

رات بھر جاگتا رہتا ہوں میں غائرؔ، جیسے
میرے ہی ذمّے ستاروں کی نگہبانی ہے

کسی کو کیا تمھیں خود بھی یقیں نہ آئے گا
تمھارے بارے میں جو پھول نے بتایا ہے

O

کسی کو کچھ، کسی کو کچھ بتاتے
وہ ملتا تو اُسی کو کچھ بتاتے

ہماری بات جو سنتی وہ دل سے
تو ہم بھی بے دلی کو کچھ بتاتے

اگر ہوتے در و دیوار اپنے
در و دیوار ہی کو کچھ بتاتے

ہمی جاگے نہیں اُس رات ورنہ
ستارے کیوں کسی کو کچھ بتاتے

ہماری ہم زباں تھی، راز داں تھی
مگر کیا خامشی کو کچھ بتاتے

کُھلا، دہلیز سے احوال گھر کا
دریچے کیوں گلی کو کچھ بتاتے

ہمیں معلوم ہی کچھ کب تھا غائرؔ
جو ہم اِس زندگی کو کچھ بتاتے

وقت بھی عجلت میں آیا تھا اِدھر
اور ہم نے بھی اُسے چلتا کِیا

O

کیسی راحت ہے یہ اک خواب سے عاری کے لیے
وقت ملتا ہی نہیں وقت گزاری کے لیے

مجھ سے ناراض پرندو، تمھیں معلوم نہیں
میں نے یہ جال بنایا ہے شکاری کے لیے

روز آتا ہے کوئی بادشہ لے جاتا ہے
شہر میں بھیک نہیں بچتی بھکاری کے لیے

اب وہ اِس باغ میں آئی ہے تو کیا آئی ہے
ایک بھی پھول نہیں بادِ بہاری کے لیے

زندہ رہ کر مجھے اندازہ ہُوا ہے غائرؔ
زندگی کم ہے بہت دوستی یاری کے لیے

O

زمیں سے ختم پرندوں کی بے گھری کریں گے
کہ زرد شاخیں ہیں جتنی ہری بھری کریں گے

یقین جانیے یہ قید عمر بھر کی ہے
کہ خواب موت سے پہلے کہاں بری کریں گے

میں آنے والے دنوں کو بہ غور دیکھتا ہوں
یہ میرے دوست مرا ذکر سرسری کریں گے

اِسی خیال سے زخموں کی رونمائی نہ کی
رفوگراں بھی کہاں تک رفوگری کریں گے

تمھاری طرح کوئی مصلحت پسند نہیں
بُری لگے تو لگے بات ہم کھری کریں گے

خزاں ہو، دھوپ یا بارش کھڑے رہیں گے درخت
کھڑے رہیں گے ہم ایسوں کی دلبری کریں گے

بکھرے ہوئے وجود کو آخر بہم کِیا
جب کچھ نہ کر سکے تو اُداسی کو کم کِیا

O

ساتھ رہ کر بھی کوئی ساتھ کہاں دیتا ہے
مجھ کو پیغام عجب آبِ رواں دیتا ہے

ایک وہ شہر کہ مجنوں بھی جسے کھلتا تھا
ایک یہ شہر کہ جو سب کو اَماں دیتا ہے

خاکساری پہ مری کیا مجھے شک ہو کہ یہاں
دل سا پتھر بھی مرے حق میں بیاں دیتا ہے

رہ گزر آج بھی ہے، نقشِ قدم آج بھی ہیں
ہاں مگر کوئی توجّہ ہی کہاں دیتا ہے

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

شہرِ جاں دیکھ سکوں، دشتِ زیاں دیکھ سکوں
اِتنی مہلت بھی کہاں کارِ جہاں دیتا ہے

شہرِ آئندہ سے جا جا کے پلٹ آتا ہوں
مجھ کو آواز جہانِ گزراں دیتا ہے

چلتے چلتے جو کبھی دشت میں تھک جاتا ہوں
اِک تسلّی سی مجھے ابرِ رواں دیتا ہے

(اپنی بیٹی حورین بانو کے لیے)

تیرے آنے سے کُھلا ہے یہی دنیا ہے مری
میں سمجھتا تھا کوئی دوسری دنیا ہے مری

O

خواب لپٹے ہیں عجب دیدۂ بیدار کے ساتھ
نیند آتی ہے مجھے صبح کے آثار کے ساتھ

تھک گئی گردشِ ایّام بھی چلتے چلتے
اور میں دوڑ رہا ہوں اُسی رفتار کے ساتھ

دل کو دنیا سے علاقہ ہے تو بس اِتنا ہے
جیسے دیوار اُٹھا دے کوئی دیوار کے ساتھ

جانے یہ شہرِ سخن ہے کہ ہے بازارِ سخن
لوگ آتے ہیں یہاں درہم و دینار کے ساتھ

میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اُٹھائی تلوار
ورنہ رکھی تھی وہیں ڈھال بھی تلوار کے ساتھ

لطف کچھ اور ہی ہے ایسے اکیلے پن کا
پھر کے دیکھا ہے بہت شہر میں دو چار کے ساتھ

اور ہوں گے جو میاں دل سے پریشاں ہوں گے
میں نے تو عمر گزاری ہے اِس آزار کے ساتھ

آپ اِس شہر کی تعمیر بہت دیکھ چکے
اب ذرا دیکھیے، تعمیر کو معمار کے ساتھ

زندگی ہے کسی عجلت میں لکھا افسانہ
کون اِنصاف کرے گا مرے کردار کے ساتھ

O

میں نہ پہنچا تو گھر گئے میرے
رات، احباب ڈر گئے میرے

اِس سے پہلے کہ جام بھرتا میں
یک بہ یک زخم بھر گئے میرے

رات میں اُس گلی سے کیا گزرا
جیسے، سب دن گزر گئے میرے

میں کہاں تک گیا، نہیں معلوم
دُور تک بال و پَر گئے میرے

اُن سے اب حال کہہ کے دیکھتا ہوں
شعر تو بے اثر گئے میرے

میں تو اپنی طرف گیا غائرؔ
کس طرف ہمسفر گئے میرے

اب تو ایسا ہے کہ وہ شخص مجھے
یاد آتا ہے بھلانے کے لیے

O

ہوا کا خوف، اندھیرے کا ڈر بھی رہتا ہے
چراغ جلتے ہوئے باخبر بھی رہتا ہے

یہ بھول بھال کے رہتا ہوں میں سمندر میں
کہ آس پاس ہی کوئی بھنور بھی رہتا ہے

وہ جس گلی میں مری خاک اُڑتی پھرتی ہے
اُسی گلی میں کوئی کوزہ گر بھی رہتا ہے

کھلا یہ بھید ہمارے اُداس رہنے سے
بجھا بجھا سا چراغِ ہنر بھی رہتا ہے

یہی نہیں کہ دھرا ہے ہمارے کاندھوں پر
یہ کیسا بوجھ ہے، اعصاب پر بھی رہتا ہے

عجیب بات ہے کاشفؔ حسین اِس دل میں
کہ دُکھ بھی رہتے ہیں اور چارہ گر بھی رہتا ہے

ممکن ہے یہ دیوار و در بول پڑیں
خالی گھر ہے، پھر سے شور مچایا جائے

O

دروازے کو دستک زندہ رکھتی ہے
جیسے دل کو دھک دھک زندہ رکھتی ہے

منظر کو زندہ رکھتی ہے بینائی
بینائی کو عینک زندہ رکھتی ہے

آ جاتے ہیں شام ڈھلے کچھ دوست یہاں
ہم ایسوں کو بیٹھک زندہ رکھتی ہے

جیسے ہی چپ ہوتے ہیں، مر جاتے ہیں
کچھ لوگوں کو بک بک زندہ رکھتی ہے

اک مہندی میں جا کر یہ معلوم ہُوا
کچھ گیتوں کو ڈھولک زندہ رکھتی ہے

زندہ ہیں اِس شور میں ہم خاموشی سے
اب خاموشی جب تک زندہ رکھتی ہے!

(عزیز دوست ذوالفقار عادل کے لیے)

آنا تھا ایک روز بُرا وقت، آ گیا
لیکن یہ بات کیا ترے جانے سے جوڑیے

O

ہر ایک منظرِ جاں کو بجھا کے رکھ دیا ہے
کہ ہم نے عشق مقابل انا کے رکھ دیا ہے

بُرے دنوں میں کسی روز کام آئے گا
سو اچھے وقت میں کچھ زہر لا کے رکھ دیا ہے

کسی طرف بھی مجھے دیکھنے نہیں دیتا
اِس آئینے نے تو پتھر بنا کے رکھ دیا ہے

وہ ایک پھول جو رکھا تھا میں نے اُس کے لیے
اُٹھایا اس نے مگر مسکرا کے رکھ دیا ہے

عجیب شور تھا دیوار و در بھی کانپ اٹھے
عجیب شور تھا مجھ کو ہلا کے رکھ دیا ہے

خدا کا کام تھا خلقِ خدا سے کیوں کہتے
سو اپنا مسئلہ آگے خدا کے رکھ دیا ہے

O

خوش بہت غم زدوں میں رہتا ہوں
دیر تک دوستوں میں رہتا ہوں

کیا کسی کو ملے سراغ مرا
آنے والے دنوں میں رہتا ہوں

تاکہ احساس بے گھری کا نہ ہو
اِس لیے بے گھروں میں رہتا ہوں

مجھ پہ کیا ہوں رُتیں اثر انداز
اپنے ہی موسموں میں رہتا ہوں

عشق سب سے بڑی حقیقت ہے
میں بھی کن واہموں میں رہتا ہوں

میں جو آزاد ہوں کسے معلوم
قید اپنے پروں میں رہتا ہوں

میں وہ خلوت نشین ہوں غائرؔ
جو سبھی محفلوں میں رہتا ہوں

O

کون تھا جس نے اُداسی کی پذیرائی کی
کیسے بنیاد پڑی شہر میں تنہائی کی

روز و شب اپنے بکھرنے میں ہی مصروف ہوں میں
اِتنا مصروف، کہ فرصت نہیں یکجائی کی

ڈوب بھی سکتے ہیں یہ سطح پہ رہنے والے
اِن سے باتیں نہ کِیا کیجیے گہرائی کی

بند آنکھوں سے بھی ہر وقت نظر آتا ہے
کیسا منظر ہے ضرورت نہیں بینائی کی

اجنبی اپنے لیے ہوں کہ زمانے کے لیے
دیکھتا رہتا ہوں تصویر شناسائی کی

اِس تماشے کو خدا دیکھنے والا ہے بہت
کیا ضرورت ہے کسی اور تماشائی کی

یوں نہ ہو دل سے تجھے ہاتھ اُٹھانا پڑ جائے
دیکھ! دنیا کو ابھی اپنی ضرورت نہ بنا

O

سُن کر میری کہانی کو
دُکھ پہنچا ویرانی کو

تشنہ لبی سے پیاس بجھا
آگ لگا دے پانی کو

مشکل ہی سے سمجھا ہوں
دنیا کی آسانی کو

آئینے سے ملیے اور
کم کیجے حیرانی کو

کس صحرا سے نسبت ہے
دل کی اِس طغیانی کو

ڈھانپ سکیں گی پلکیں کیا
منظر کی عریانی کو

لے جائے آفتاب کہاں اپنی دھوپ کو
جس سے بھی پوچھیے اُسے سایہ پسند ہے

O

یاد وہ سانحہ کیے جائیں
خود کو یوں غمزدہ کیے جائیں

ایسے جُڑ جائیں اس دیے سے ہم
عمر بھر رتجگا کیے جائیں

میں اچانک کہیں چلا جاؤں
اور سب رابطہ کیے جائیں

اِس سے پہلے خیال ہی نہ رہے
خواب کا تذکرہ کیے جائیں

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

اِس مکاں کی سلامتی کے لیے
اور کب تک دُعا کیے جائیں

آج چودہ اگست ہے غائرؔ
سب پرندے رہا کیے جائیں

جس کو دیکھو یہی سمجھتا ہے
جو مرا حال ہے، کسی کا نہیں

O

دشت نے اُس سے رعایت نہیں کی
جس نے دیوانے کی عزت نہیں کی

یاد کرنا تو کُجا میں نے اُسے
بھول جانے کی بھی زحمت نہیں کی

عشق میں حال ہی کچھ ایسا تھا
ایک حالت پہ قناعت نہیں کی

O

وجود اپنا برائے عدم بناتا ہوں
پرانے غم سے نیا ایک غم بناتا ہوں

یہ دیکھتی ہی نہیں بولنے بھی لگتی ہے
اِسی لیے تو میں تصویر کم بناتا ہوں

مرے ہُنر سے بہت کینوس پریشاں ہے
میں جو بھی آنکھ بناتا ہوں، نم بناتا ہوں

بنانے والا عجب ہوں کہ اب زمیں ہی نہیں
میں آسمان بھی زیرِ قدم بناتا ہوں

مرے علاوہ نہیں ہے کوئی حریف مرا
میں خود کو تختۂ مشقِ ستم بناتا ہوں

کسی کسی پہ ہی ہوتا ہوں منکشف غائرؔ
مرا مزاج ہے میں دوست کم بناتا ہوں

ایک دن کیا ترا خیال آیا
پھر ترا ہی خیال آتا رہا

O

محبت اک انوکھا واقعہ ہے
یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے

سناؤں تو سبھی افسانہ سمجھیں
مجھے یاد ایک ایسا واقعہ ہے

ہماری زندگی میں ہونے والا
محبت سب سے پہلا واقعہ ہے

جسے تم داستاں کہتے ہو اپنی
حقیقت میں کسی کا واقعہ ہے

توجہ چاہتا ہے عشق، صاحب!
یہ کوئی ایسا ویسا واقعہ ہے

ذرا میں چپ ہُوا تو سب نے پوچھا
یہ کیا قصّہ ہے؟ یہ کیا واقعہ ہے؟

سنائی میں نے اپنی آپ بیتی
تو بولے لوگ: اچھا واقعہ ہے!

وسعتِ دل ہے بے کنار بہت
ورنہ میں بھی کہیں نکل جاتا

O

ورنہ اِس شہر میں رہتا ہے کوئی کیا آباد
میرے احباب سلامت، مری دنیا آباد

کتنے بے گھر اِسی سائے میں پڑے رہتے ہیں
تا قیامت رہے اِس پیڑ کا سایہ آباد

میں بھی اُس شہر سے ہو آؤں، اُسے دیکھ آؤں
جس کو رہتا ہے سدا دیکھنے والا آباد

بے زبانی ہے الگ، اُس کی کہانی ہے الگ
وہ جو اک شہر تھا صاحب، لبِ دریا آباد

لاکھ ویران سہی شہرِ محبت لیکن
میں نے اِس شہر کو لکھا ہے ہمیشہ آباد

روز کرتا ہوں دعا اپنے کراچی کے لیے
اور اُس کے لیے جس نے یہ کِیا تھا آباد

مجھ سے پوچھے کوئی اِس شہر کی بابت غائرؔ
کتنا ویران ہے اندر سے یہ کتنا آباد

بنتا جاتا ہے یہ گھر شہرِ خموشاں غائرؔ
شور کرتا ہوں تو بیکار نہیں کرتا میں

O

اِک گھر میں مقیّد ہُوا، اِک گھر سے نکل کر
جاتا بھی کہاں خواب کے چکّر سے نکل کر

دنیا کبھی گھر سے نظر آتی ہی نہیں ہے
ہاں، دیکھنا پڑتا ہے اِسے گھر سے نکل کر

وہ خواب، وہ احباب، یہاں کچھ بھی نہیں اب
کیا شام گزارے کوئی دفتر سے نکل کر

اب ڈھنگ ہی کچھ اور ہے، آہنگ ہی کچھ اور
کیا رنگ ہُوا ہے مرا منظر سے نکل کر

دنیا کی طلب ہے تو کوئی اِس کا سبب ہے
آتے نہیں آنسو یونہی اندر سے نکل کر

پوچھا ہی نہیں میں نے کبھی وقت سے غائرؔ
جاتا ہے کہاں میرے برابر سے نکل کر

دفترِ عشق کیا ہُوا ہے بند
دل تو بے روزگار ہوگیا ہے

O

غم ایک طرف رکھ جو زمانے سے ملا ہے
یہ زخم تجھے، زخم دکھانے سے ملا ہے

جا جا کے بتاتا ہوں میں ہر شاخِ سمن کو
اک پھول مجھے اپنے سرہانے سے ملا ہے

اک عمر سے تھی اپنے ہی سائے کی تمنّا
سو مجھ کو سکوں دھوپ میں آنے سے ملا ہے

ملتا ہی کہاں تھا مجھے خود اپنا پتا بھی
لگتا ہے ترے چھوڑ کے جانے سے ملا ہے

کچھ ہرج نہیں اِس میں ملا لیجیے دل بھی
شانہ بھی تو آخر مرے شانے سے ملا ہے

اِتنا تو میں واقف ہوں غمِ عشق سے غائرؔ
کمبخت! یہ بھی تیرے بہانے سے ملا ہے

درد مشکل میں پڑا رہتا ہے
جب تلک دل میں پڑا رہتا ہے

O

ہر گام بدلتے رہے منظر مرے آگے
چلتا ہی رہا کوئی برابر مرے آگے

کیا خاک مری خاک میں امکان ہو پیدا
ناپید ہیں موجود و میسر مرے آگے

یوں دیکھنے والوں کو نظر آتا ہوں پیچھے
رہتا ہے مسافت میں مرا گھر مرے آگے

رکھتی ہے عجب پاس مری تشنہ لبی کا
سو موج اُٹھاتی ہی نہیں سر مرے آگے

ہنستا ہی رہا میں در و دیوار پہ اپنے
روتا ہی رہا میرا مقدر مرے آگے

کل رات جگاتی رہی اک خواب کی دُوری
اور نیند بچھاتی رہی بستر مرے آگے

واقف ہی نہیں کوئی اُن آنکھوں کی روِش سے
کم کم جو کھلا کرتی ہیں اکثر مرے آگے

دیکھے ہی نہیں میں نے کبھی آنکھ میں آنسو
پہنا ہی نہیں اُس نے یہ زیور مرے آگے

غائرؔ میں کئی روز سے خاموش ہوں ایسا
گویا نظر آتے ہیں یہ پتھر مرے آگے

O

دل میں تیری محبت بڑھتی جاتی ہے
ویرانے کی قیمت بڑھتی جاتی ہے

رُکتا ہوں تو سانس بھی رُکنے لگتا ہے
چلتا ہوں تو ہمت بڑھتی جاتی ہے

نیکی کرنا کوئی انوکھا کام ہے کیا؟
کیوں لوگوں کی حیرت بڑھتی جاتی ہے

خوش ہوں بھائی! میں اپنی تنہائی سے
اپنے آپ سے قربت بڑھتی جاتی ہے

غائرؔ اک مدّت سے اپنی قید میں ہوں
اور اِس قید کی مدّت بڑھتی جاتی ہے

O

عمر بھر عشق کا پردہ رکھا
یعنی اِس آگ کو ٹھنڈا رکھا

آخرش تشنگی سے تنگ آ کر
نام اِس دشت کا دریا رکھا

یک بہ یک راہگزر جاگ اٹھی
شہر میں ہم نے قدم کیا رکھا

ہم نے پہنا ہی نہیں غم کا لباس
ہو گیا میلا یہ رکھا رکھا

اُس نے گھر میں رکھا تھا آئینہ
ہم نے آئینے میں چہرہ رکھا

اس کو کہتے ہیں مسافت غائرؔ
لوٹ جانے کا بھی رستہ رکھا

کہاں کارِ جہاں دل سے چلے گا
یہ کاروبار مشکل سے چلے گا

O

وہ ایک رات ہَوا کی جو داستاں سنتے
تو پھر چراغ کسی اور کی کہاں سنتے

کوئی گواہ ہمارا بھی لازمی ہوتا
اگر یہ بات مکیں کی جگہ مکاں سنتے

بہت گلی نے سُنا شور کاروانوں کا
گلی کا شور بھی اک روز کارواں سنتے

زمیں نے اپنی کہانی کبھی کہی ہی نہیں
زمیں جو کہتی تو پھر سات آسماں سنتے

جو میرے لوگ ہیں، مجھ تک پہنچ ہی جائیں گے
وہ میرا تذکرہ اک دن یہاں وہاں سنتے

مزہ تو جب ہے یونہی زندگی گزر جائے
یہ رات جیسے کٹی ہے کہانیاں سنتے

دشت میں مصرفِ تنہائی نہیں ہے کوئی
کیا تماشا ہے، تماشائی نہیں ہے کوئی

O

فیصلہ ہاں نہیں پہ چھوڑ گیا
وہ تو سب کچھ ہمیں پہ چھوڑ گیا

کچھ دنوں دل میں کیا رہا وہ غزال
ساری وحشت یہیں پہ چھوڑ گیا

کیا عجب تھا وہ دُور کا منظر
نقش سا دُوربیں پہ چھوڑ گیا

جانے کیا سوچ کر ستارہ ساز
کچھ ستارے زمیں پہ چھوڑ گیا

آستیں چھوڑ تو گیا وہ سانپ
پر نشاں آستیں پہ چھوڑ گیا

صاحبِ بزم، کارِ بزمِ جہاں
مجھ سے خلوت نشیں پہ چھوڑ گیا

بسی ہوئی ہے ترے ہاتھ کی مہک اِس میں
یہ پھول میرے لیے باغ سے کوئی کم ہے

O

ملال کرتے رہے وقت کے گزرنے کا
یہی تو کام بچا تھا ہمارے کرنے کا

ہے کارِ عشق وہ نیکی کہ عمر بھر ہم کو
ثواب ملتا رہے گا کسی پہ مرنے کا

قریب گاؤں نہیں، راہ میں بھی چھاؤں نہیں
کوئی جواز نہیں ہے مرے ٹھہرنے کا

کہیں ملا جو مجھے وقت تو یہ پوچھوں گا
کہ دام کیا ہے بتا ایک زخم بھرنے کا

عجیب نشّہ ہے غائرؔ، یہ ہوشمندی بھی
کسی طرح بھی یہ نشّہ نہیں اُترنے کا

O

اب یہ عالم ہے کہ تصویر اسے تکتی ہے
اور تصویر کو تصویر بنانے والا

اک صدا آتی ہے زنجیر سے گاہے گاہے
خود گرفتار ہے زنجیر بنانے والا

لوگ بس شکوۂ تقدیر کیے جاتے ہیں
اور مصروف ہے تقدیر بنانے والا

O

کسی کو تیرے سِوا یاد کیوں نہیں کرتا
مری طرح مرا ہمزاد کیوں نہیں کرتا

خدا بھی خلقِ خدا کی طرح خفا تو نہیں
پکارتا ہوں تو اِمداد کیوں نہیں کرتا

سوال کرتا ہے ہر روز مجھ سے عکس مرا
تُو کون ہے؟ مجھے آزاد کیوں نہیں کرتا؟

سکوتِ شب ہے یہ شورِ سحر سے ٹوٹے گا
خدا کے سامنے فریاد کیوں نہیں کرتا

اب آسمان کہاں تک سنے زمین کا دکھ
یہ کام کوئی زمیں زاد کیوں نہیں کرتا

کچھ ایسی بات نہیں شہر کا اُجڑ جانا
اُجڑ گیا ہے تو آباد کیوں نہیں کرتا

یہ جو کچھ دھوپ پڑی ہے مری دیوار کے ساتھ
اس کی بنتی ہی نہیں سایۂ اشجار کے ساتھ

O

یہ جہاں تک راستہ موجود ہے
اِس سے آگے بھی خدا موجود ہے

عکس کیا، عکّاس بھر سکتا نہیں
آئنے میں وہ خلا موجود ہے

لیکن اب میں اور میرا گھر کہاں؟
شہر تو اپنی جگہ موجود ہے

ان درختوں، ان زمیں زادوں کے پاس
ہر پرندے کا پتا موجود ہے

بے نیازانہ گزر دنیا سے تُو
بے نیازی کا صلہ موجود ہے

اِسم سے بھریے اُسے یا جسم سے
ہر جگہ، خالی جگہ موجود ہے

موت کا کیا کام جب اِس شہر میں
زندگی جیسی بلا موجود ہے

ہم تہی دست اٹھا لاتے ہیں
گھر میں ہر روز ہی بازار کا دکھ

O

مری طرح کوئی برباد ہونے والا نہیں
یہ دشتِ عشق اب آباد ہونے والا نہیں

بس ایک دن اِسے زنجیر خود رہا کرے گی
یہ قیدی ایسے تو آزاد ہونے والا نہیں

بلاسبب یہاں لوگوں سے کون ملتا ہے
یہ کارِ خیر مرے بعد ہونے والا نہیں

سبھی کو شوق یہاں انکشافِ ذات کا ہے
مگر وہ آئینہ اِیجاد ہونے والا نہیں

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

پڑھا رہے ہو سبق دل کو دنیاداری کا
پڑھائے جاؤ اِسے یاد ہونے والا نہیں

یہ کہہ کے کارِ جہاں کوئی مجھ کو سونپ گیا
یہ کام مجھ سے تو اُستاد ہونے والا نہیں

اے عشق ہمیں دیکھ! ہمیں دیکھ! کہ ہم نے
مانا ہے تجھے تیری کرامات سے پہلے

O

کوئی تو بات ہوگی رفتگاں میں
عجب رونق سی ہے خالی مکاں میں

یہ کوئی اور ہی موسم ہے شاید
کہ پتّے یوں نہیں گرتے خزاں میں

اِدھر سینے میں دل مردہ پڑا ہے
بھروں کیا رنگ میں تصویرِ جاں میں

کوئی بتلائے کیا کہتے ہیں، آخر
ہواؤں کو، چراغوں کی زباں میں

کہیں ایسا نہ ہو کردار میرا
پڑا رہ جائے یونہی داستاں میں

بجز اِس کے کہ وہ لگتے ہیں اچھے
کوئی خوبی نہیں کاشفؔ میاں میں

ٹوٹ جائے نہ آئینہ جب تک
ٹوٹ جانے کا ڈر نہیں جاتا

O

میری آوارگی واقعہ بن گئی
خاک اِتنی اُڑی، کیمیا بن گئی

لوگ مجھ کو مصوّر سمجھنے لگے
ایک تصویر سی مجھ سے کیا بن گئی

آخرش میں کسی عکس میں ڈھل گیا
اور وہ میرے لیے آئینہ بن گئی

بعد از مرگ بھی ہم تو ملتے رہے
میں دیا بن گیا، وہ ہوا بن گئی

اور بھی لوگ محفل میں خاموش تھے
کیوں مری خامشی مسئلہ بن گئی

کشتیِ ذات کو ڈوبنے کب دیا
ایک اک آرزو ناخدا بن گئی

ہم بھی مجنوں سے نظر آتے ہیں
گھر بھی لگتا ہے بیاباں سا کچھ

O

خواب و خواہش سے بھر دیا ہے مجھے
دل نے مصروف کر دیا ہے مجھے

میری دیوانگی سے واقف تھا
جس نے صحرا میں گھر دیا ہے مجھے

اُس نے دل کو بنا کے آئینہ
ٹوٹ جانے کا ڈر دیا ہے مجھے

بات کرتا ہے ہمسفر کی طرح
کیسا زادِ سفر دیا ہے مجھے

وقت بھی ہے عجیب سوداگر
خواب لے کر، ہنر دیا ہے مجھے

میرے اندر کے شور نے غاؔئر
کیسا خاموش کر دیا ہے مجھے

کیسے کیسے چراغ تھے جن کا
نام تک روشنی کو یاد نہیں

O

پھر وہی کچھ یہاں دکھائی دیا
جس میں اپنا زیاں دکھائی دیا

مجھ میں اک دوسرا بھی تھا لیکن
آئنے میں کہاں دکھائی دیا

ہر مکاں میں مکیں نظر آئے
اِک مکیں میں مکاں دکھائی دیا

روشنی کی طرح اندھیرا بھی
روشنی میں نہاں دکھائی دیا

میں اسے دیکھتا رہا جب تک
آسماں، آسماں دکھائی دیا

پیاس سیراب کرچکی، تو مجھے
پھر وہ آبِ رواں دکھائی دیا

ان درندوں کے درمیاں غائر
آدمی بے زباں دکھائی دیا

مری خلوت اُجڑ جائے گی ،آخر
اگر یونہی تری محفل میں آیا

○

وقت سے جان چھڑا لی میں نے
وہ گھڑی توڑ ہی ڈالی میں نے

رنگ سے رنگ کِیا ہے پیدا
بات سے بات نکالی میں نے

اَبر سے کوئی شکایت نہیں کی
صبر سے پیاس بجھالی میں نے

کون کرتا پھرے خوابوں کا زیاں
چھوڑ دی خام خیالی میں نے

در و دیوار سے باتیں کر کے
اور تنہائی بڑھالی میں نے

عمر بھر راہ سجھائی دل کو
اِس مسافر سے دعا لی میں نے

اپنی ہی چھاؤں میں بیٹھا غائرؔ
اپنی ہی دھوپ نکالی میں نے

در بدروں کے ناز اُٹھایا کرتی ہے
دھوپ ہمیشہ مجھ پہ سایہ کرتی ہے

O

یہ رتجگوں کا سفر اب تمام کرتا ہوں
میں اپنے خواب اُن آنکھوں کے نام کرتا ہوں

کسی بھی روز مجھے دل سزا سنا دے گا
میں خواہشوں کا بہت قتلِ عام کرتا ہوں

اگر یہ دشت بھی مجھ کو قبول کرتا نہیں
تو ٹھیک ہے میں کوئی اور کام کرتا ہوں

مجھے یہ کس نے بتایا کوئی نہیں ہے یہاں
کوئی نہیں ہے تو کس سے کلام کرتا ہوں

کوئی سوال نہ پوچھے گا اِس کی بابت اب
میں گفتگو کا یہیں اختتام کرتا ہوں

O

ایک سے ایک پریشانی سے
میں گزرتا رہا آسانی سے

درودیوار پہ اُگتی ہوئی گھاس
کیا نمو پاتی ہے ویرانی سے

دیکھنے والی تھی حیرت اس کی
میں نے جب آگ لکھا پانی سے

ہے سفر ایسا ہی درپیش تو پھر
کام لے بے سر و سامانی سے

رات ہی دیکھے ستاروں کو اب
باز آیا میں نگہبانی سے

ہم سے آباد ہے دنیا غائرؔ
جیسے زنداں، کسی زندانی سے

دل کو دُنیا کی ستائش سے الگ رکھا ہے
میں نے یہ پھول نمائش سے الگ رکھا ہے

O

عشق پر ایمان کتنے دن رہا
تم کو میرا دھیان کتنے دن رہا

زندگی کی دھوپ کتنے دن رہی
سائے کا احسان کتنے دن رہا

گھر کبھی آباد ہو تو پھر کھلے
گھر مرا ویران کتنے دن رہا

نقش ہے دل کے در و دیوار پر
کون یاں مہمان کتنے دن رہا

O

گزری ہے عجب عشق کا معیار بناتے
اِس راہ کو کچھ اور بھی دُشوار بناتے

اندر کی گھٹن کا ہمیں اندازہ نہیں تھا
ورنہ یہ مکاں اور ہوادار بناتے

کیا جانیے کب تک ہو مکمل تری تصویر
اک عمر ہوئی ہے لب و رخسار بناتے

دو دن سے زیادہ ہمیں رہنا ہی نہیں تھا
دو دن کے لیے کیا در و دیوار بناتے

اچھا کِیا بروقت اُسے چھوڑ کے ہم نے
اب کیا اُسے اپنے لیے آزار بناتے

تصویر میں بھرتے رہے رنگوں سے اُجالا
کاغذ پہ رہے صبح کے آثار بناتے

اس کی لہروں سے کئی خواب جُڑے ہیں میرے
دل وہ دریا ہے جسے پار نہیں کرتا میں

O

دیکھنے والوں کو مشکل سے نظر آتا ہوں
کہ میں آنکھوں سے نہیں، دل سے نظر آتا ہوں

عمر بھر راہ کی مانند سفر ہے میرا
وہ مسافر ہوں جو منزل سے نظر آتا ہوں

مجھ کو ڈوبے ہوئے اک عمر ہوئی پر اب تک
مسکراتا ہوا ساحل سے نظر آتا ہوں

پوچھتی رہتی ہے تنہائی ، بتاتا ہی نہیں
کیوں گریزاں میں محافل سے نظر آتا ہوں

اپنی فطرت سے پریشان ہوں کاشف غائرؔ
اور پریشان مسائل سے نظر آتا ہوں

O

مجھ سے کیسے چھپا لیا ہے مجھے
کس اندھیرے نے آلیا ہے مجھے

عشق والے کبھی نہیں مرتے
اُس نے زندہ اُٹھا لیا ہے مجھے

جل اُٹھا تو بجھا دیا اُس نے
بجھ گیا تو جلا لیا ہے مجھے

جن عناصر سے زندگی تھی مری
اُن عناصر نے کھا لیا ہے مجھے

ہے ابھی تک مجھے تلاش اپنی
اُس نے کس طرح پا لیا ہے مجھے

ڈوب جانے کے خوف نے غائرؔ
ڈوبنے سے بچا لیا ہے مجھے

گھر کے آنگن سے بھی بانٹا نہ گیا
ایک گرتی ہوئی دیوار کا دکھ

O

گزشتگاں میں ہمارا شمار ہونے میں
اب اور وقت ہے کتنا غبار ہونے میں

تُو میرا راز بھی کیسے چھپا گیا مجھ سے
ترا جواب نہیں رازدار ہونے میں

یہ قید خانہ بھی اک شب میں کتنا پھیل گیا
اب اور دیر لگے گی فرار ہونے میں

یہاں کسی کا کوئی غمگسار کیوں ہوگا
کہ فائدہ ہی نہیں غمگسار ہونے میں

ہے ایک عمر کا حاصل ہماری بیکاری
گنوائیں کیوں اِسے مصروفِ کار ہونے میں

اِس ایک اشکِ ندامت پہ ناز کر غائرؔ
کہاں یہ بات عبادت گزار ہونے میں

وہ گلی ہے مرے لیے، لیکن
اُس گلی کے لیے نہیں ہوں میں

O

مشکل تھا جو بھی کام وہ مشکل نہیں رہا
میں جب سے اپنی راہ میں حائل نہیں رہا

کیسے کسی کی راہ وہ دیکھے گا عمر بھر
جو خواب دیکھنے کے بھی قابل نہیں رہا

ہر چند اب ہے بزم سے اُٹھنے میں عافیت
اپنی جگہ سے کوئی مگر ہل نہیں رہا

مصروف تھا تو سب ہی تھے حلقہ کیے ہوئے
فرصت ملی تو یار کوئی مل نہیں رہا

اب اپنے قتل کا کسے الزام دیجیے
اِس شہر میں تو ایک بھی قاتل نہیں رہا

اک عمر کی ہے دل کے لگانے میں احتیاط
اور اتنی احتیاط کہ دل، دل نہیں رہا

کاشفؔ حسین دل کے سبھی زخم سی لیے
اک بے دلی کا زخم ہے جو سِل نہیں رہا

تری طرف سے بھی دل بے دلی کے ساتھ آیا
یہ جس کے ساتھ گیا تھا اُسی کے ساتھ آیا

O

تیرا خیال، تیری تمنّا تک آ گیا
میں دل کو ڈھونڈتا ہُوا دنیا تک آ گیا

کیا اِتنا بڑھ گیا مری تشنہ لبی کا شور
سیلاب دیکھنے مجھے صحرا تک آ گیا

لیکن خزاں کی نذر کِیا آخری گلاب
ہر چند اِس میں مجھ کو پسینہ تک آ گیا

آگے رہِ فراق میں آنا ہے اَور کیا
آنکھوں کے آگے آج اندھیرا تک آ گیا

کیا اِرتقا پذیر ہے انسان کا شعور
رشتوں کو چھوڑ چھاڑ کے اشیا تک آ گیا

لیکن کسی دریچے سے جھانکا نہ کوئی رات
سُن کر مری پکار ستارہ تک آ گیا

کاشفؔ حسین یار اُٹھو، اب تو چل پڑو!
چل کر تمھارے پاؤں میں رستہ تک آ گیا

ہم لوگ ہیں حالات کے ملبے میں دبے لوگ
چیخیں بھی تو آواز سنائی نہیں دیتی

O

ہَوا کا رنگ سرِ رہ گزار ایسا ہُوا
کہ میری خاک سے پیدا غبار ایسا ہُوا

بس ایک روز کھلی مجھ پہ میری بیکاری
اور اس کے بعد میں مصروفِ کار ایسا ہُوا

پھر اُس کے بعد کچھ اپنا سراغ مل نہ سکا
میں اپنی قید سے اک دن فرار ایسا ہُوا

میں دشتِ ہجر کو تو بے کنار سمجھا تھا
مگر یہ دشت بھی اک روز پار ایسا ہُوا

خفا خفا سے تھے اُس شہر کے در و دیوار
میں ایک عمر میں لوٹا تو یار ایسا ہُوا

میں اپنی فتح کے آثار دیکھ کر خوش تھا
مگر قریب سے پھر ایک وار ایسا ہُوا

آنکھ کو خواب کا عادی نہیں ہونے دوں گا
یعنی برباد یہ وادی نہیں ہونے دوں گا

O

خوشی کشید کرے دل غمِ جدائی سے
نکل گیا ہوں میں آگے غزل سرائی سے

میں اپنے گرد تماشا لگائے بیٹھا ہوں
عجیب کام لیا ہے شکستہ پائی سے

اگر دماغ کی سنتا تو میں بھٹک جاتا
پہنچ گیا ہوں کہیں دل کی رہنمائی سے

مٹا سکا نہ اُسے صبح کا اُجالا بھی
جو غم ملا ہے چراغوں کی بے وفائی سے

ذرا یہ سوچیے خلقِ خدا کا کیا ہوگا
خدا بھی ہاتھ اُٹھالے اگر خدائی سے

نگاہ دل کے لیے روز خواب لاتی ہے
کہ چل رہا ہے یہ گھر اب اِسی کمائی سے

سخنوری کے لیے چاہیے اک اور ہی آگ
کہ یہ دِیا نہیں جلتا، دِیا سلائی سے

کہاں جائے گی تنہائی ہماری

O

جنوں کی ناز برداری میں خوش ہے
یہ وحشی، چار دیواری میں خوش ہے

دعا اور رزق دونوں مل رہے ہیں
سو یہ مزدور بیکاری میں خوش ہے

چراغوں کے قبیلے سے ہے شاید
یہ چشمِ خواب بیداری میں خوش ہے

کوئی اب دیکھنے آئے نہ آئے
ترا بیمار، بیماری میں خوش ہے

نیا مجنوں محبت سے زیادہ
محبت کی اداکاری میں خوش ہے

○

بُلا رہا ہے مجھے رہ گزار اپنی طرف
ہوا کو کھینچ رہا ہے غبار اپنی طرف

مجھے کسی کی طرف دیکھنا نہیں پڑتا
میں دیکھ لیتا اگر ایک بار اپنی طرف

پڑا ہُوا تھا میں برگِ خزاں رسیدہ سا
اُڑا کے لے گئی بادِ بہار اپنی طرف

سوال یہ ہے کہ اب کس طرح وصول کروں؟
نکل رہا ہے مرا کچھ اُدھار اپنی طرف

جو دل میں آئی کبھی رفتگاں سے ملنے کی
قدم اُٹھے مرے بے اختیار اپنی طرف

نہ جانے آج کدھر کو نکل گیا غائرؔ
تری طرف ہی وہ پہنچا، نہ یار اپنی طرف

ترے بھی دل میں محبت کی آگ روشن ہے
تو آنچ کیوں لب و رخسار تک نہیں آتی

O

بچھڑنے والوں کا کیونکر نہ غم کِیا جائے
یہ بوجھ ایسا نہیں ہے کہ کم کِیا جائے

اب اِنتظار کریں کیا کسی مؤرّخ کا
چلو یہ واقعہ خود ہی رقم کِیا جائے

میں ایک بار نہیں، بار بار ہنستا ہوں
کسی طرح تو اُداسی کو کم کِیا جائے

کوئی سبیل نہیں پیاس کو بجھانے کی
سوائے اِس کے کہ آنکھوں کو نم کِیا جائے

یہ خود سے ملنے ملانے کی ایک صورت ہے
کہ رابطہ ذرا دنیا سے کم کِیا جائے

وہ اور ہوں گے جو اِنصاف چاہتے ہیں ترا
گناہگار ہوں مجھ پر کرم کِیا جائے

کیا جانیے کیوں آنکھ بھگو جاتی ہے غائرؔ
یہ لہر مرے پاؤں بھگونے کے بجائے

O

کب اُسے دیکھتے نگاہ بھری
جا چکا وہ تو دل نے آہ بھری

کیسی نیکی ، کہاں کا کارِ ثواب
میں نے اِک قیمتِ گناہ بھری

بس یہی حاصلِ سفر ٹھہرا
اپنے دامن میں گردِ راہ بھری

جست بھر کا وہ فاصلہ ہی نہ تھا
آپ نے جست خوامخواہ بھری

آنکھیں ملتا وہ ماہتاب اُٹھا
جب ستاروں سے خواب گاہ بھری

کیا مسافت کا لطف آئے گا
راہ گیروں سے ہے یہ راہ بھری

دل جہنّم سے کم نہیں غائرؔ
دل میں دنیا ہے بے پناہ بھری

اُس گلی میں تھا اک جہاں آباد
میں گزرتا بھی سرسری کیسے

O

اب راستے میں سوچ رہے ہیں حضور کیا
جب چل پڑے ہیں آپ تو نزدیک و دُور کیا

خود کو سمیٹنا تھا تو کیوں اتنی دیر کی؟
اب چل پڑی ہوا تو ہوا کا قصور کیا

بیٹھے ہوئے ہیں آج پروں کو سمیٹ کر
اِس سانحے پہ اور کریں بھی طیور کیا

ایسی فضا کبھی نہ ہوئی آسمان کی
اِس رات ہونے والا ہے جانے ظہور کیا

جس چیز کی بساط ابھی ہے ، ابھی نہیں
میرے عزیز کیجیے اُس پر غرور کیا

کاشفؔ حسین اُس رُخِ انور کو دیکھ کر
جانا ہے روشنی نے کہ ہوتا ہے نور کیا

میں رات اپنی عیادت کو گھر میں پہنچا تو
خبر ملی کہ مرا انتقال ہوگیا ہے

O

ہماری صبح کسی شام سے نہیں ملتی
یہ وہ تھکن ہے جو آرام سے نہیں ملتی

عجیب خاک ہے اپنی کہ خاک ہو کر بھی
ہوائے گردشِ ایام سے نہیں ملتی

یہ اور کچھ بھی نہیں عشق کی کرامت ہے
تسلّی ورنہ ترے نام سے نہیں ملتی

جو زندگی دلِ ناکام سے ملی ہے مجھے
تمام عمر کسی کام سے نہیں ملتی

کاشف حسین غائر کی شاعری

پچھلے دنوں ایک ملاقات میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے کاشف حسین غآئر کے چند اشعار سنائے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کاشف حسین غآئر کے اشعار کے ساتھ دہلی کی ایک شام اِتنی یادگار بن جائے گی۔ کاشف حسین غآئر کی شاعری نے انھیں جس قدر متاثر کِیا وہ ان کے پڑھنے کے انداز سے واضح تھا۔ میں کاشف حسین غآئر کے بارے میں سوچنے لگا کہ ایک شاعر کی اس سے بڑی جیت کیا ہو سکتی ہے۔ ہر شعر پر وہ رُک جاتے تھے اور ایک دو جملوں کے بعد دوسرا شعر پڑھتے۔ شمیم حنفی صاحب سے میں نے جو شعر سنے ہیں وہ میرے حافظے کا حصہ ہیں۔

غآئر میں کئی روز سے خاموش ہوں ایسا
گویا نظر آتے ہیں یہ پتھر مرے آگے

کچھ دنوں دل میں کیا رہا وہ غزال
ساری وحشت یہیں پہ چھوڑ گیا

اس محبت کا ہو انجام بخیر
جس کا آغاز جدائی سے ہوا

ہم نے پہنا ہی نہیں غم کا لباس
ہوگیا میلا یہ رکھا رکھا

اک صدا آتی ہے زنجیر سے گاہے گاہے
خود گرفتار ہے زنجیر بنانے والا

ایک نادیدہ سی زنجیر لیے پھرتی ہے
اپنی مرضی سے یہ انسان کہاں جاتا ہے

یہ دیکھتی ہی نہیں بولنے بھی لگتی ہے
اسی لیے تو میں تصویر کم بناتا ہوں

زندگی ہے کسی عجلت میں لکھا افسانہ
کون انصاف کرے گا مرے کردار کے ساتھ

مرے ہنر سے بہت کینوس پریشاں ہے
میں جو بھی آنکھ بناتا ہوں نم بناتا ہوں

آج کل خواب کے بارے میں ہے تشویش مجھے
آنکھ کھلتے ہی یہ مہمان کہاں جاتا ہے

گذشتگاں میں ہمارا شمار ہونے میں
اب اور وقت ہے کتنا غبار ہونے میں

یہ قید خانہ بھی اک شب میں کتنا پھیل گیا
اب اور دیر لگے گی فرار ہونے میں

ہے ایک عمر کا حاصل ہماری بے کاری
گنوائیں کیوں اسے مصروف کار ہونے میں

شام ہوتے ہی کہاں جاتا ہوں کیا بتلاؤں؟
آدمی ہوکے پریشان کہاں جاتا ہے؟

بستی میں اک چراغ کے جلنے سے رات بھر
کیا کیا خلل پڑا ہے ستاروں کے کام میں

کاشفؔ حسین دشت میں جتنے بھی دن رہا
بیٹھا نہیں غبار مرے احترام میں

کاشفؔ حسین خوب ہی ہوتے ہیں اہل عشق
اِس پار بھی کھڑے ہوں تو اس پار جائیے

رات بھر جاگتا ہوں رہتا ہوں میں غائرؔ جیسے
میرے ہی ذمے ستاروں کی نگہبانی ہے

میں نہ پہنچا تو گھر گئے میرے
رات احباب ڈر گئے میرے

میں تو اپنی طرف گیا غائرؔ
کس طرف ہم سفر گئے میرے

شاعری کی طاقت یہ ہے کہ شاعر کے غیاب میں اس کی شاعری پر گفتگو ہو۔شمیم حنفی صاحب نے لکھنے کے ساتھ ساتھ گفتگو کو بڑی اہمیت دی ہے۔اصل میں ادبی کلچر بنیادی طور پر گفتگو کا ہی پروردہ ہوتا ہے۔غائرؔ بلکہ کسی بھی اچھے مصنف یا قلم کار پر گفتگو کرنا ان کے لیے جلسے اور سمینار منعقد کرنے سے زیادہ اہم ہے۔کاشف حسین غائرؔ کے شعر سنتے ہوئے مجھے اظہار کی سطح پر بہت جدت کا احساس نہیں ہوا۔جدت نہ ہوتی تو شعرا اتنے تازہ کار کیوں معلوم ہوتے۔غائرؔ کے یہاں ویسی جدت نہیں ہے جو تخلیقی اپج سے زیادہ خارجی اپج کا حاصل معلوم ہوتی ہے۔

غائرؔ کے اشعار بتاتے ہیں شاعر کلاسیکی شاعری کا گہرا شعور رکھتا ہے اور اسے پتا ہے کہ جدت کی کون سی ایسی سطح ہے جس سے شاعری کو رسمی، روایتی ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ایک معنی میں احمدؔ مشتاق کی غزل گوئی بھی اسی ہنرمندی کا پتا دیتی ہے۔بظاہر یہ شاعری روایتی معلوم ہوگی مگر

اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اسے کلی طور پر روایتی ہونے سے بچا لیتی ہے۔

اس محبت کا ہو انجام بخیر
جس کا آغاز جدائی سے ہوا

یہ ایک دعا بھی ہے اور تلخ حقیقت کا ادراک بھی۔ فراقؔ نے لمحۂ وصل میں جس طرح جدائی کی کیفیت کو دیکھا اور محسوس کیا وہ فراق کی غزل کا بڑا امتیاز ہے۔ غائرؔ کے اس شعر کو پڑھتے ہوئے فراقؔ کی یاد آنا فطری ہے۔ لیکن فراقؔ سے غائرؔ کی کیفیاتی دنیا آگے جاتی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں اس مضمون نے بڑی تخلیقی قوت فراہم کی ہے۔ انسان فطری طور پر ایک دوسرے سے گریزاں ہے۔ دوام تو فراق کو حاصل ہے وصل کو نہیں۔ کاشف حسین نے دعائیہ انداز میں المیہ صورت کو پیش کیا ہے۔ اگر ملاقات کا آغاز جدائی سے ہوا تو گویا یہ ایک طرح سے ابتدا ہی نہیں بلکہ انجام بھی ہے۔ محبت کا آغاز میں جدا ہو جانا اسی گریز کا پتا دیتا ہے۔ ایسے میں محبت کا انجام بخیر ہی ہوگا، مگر کاشف حسین نے ایک ذرا سی ابتدائی ملاقات کو بہت اہمیت دی ہے۔ یہ ایک لمحہ بھی اتنا اہم ہے کہ اس کے بہتر انجام کی دعا دی جا سکتی ہے۔ جدائی کا مطلب الگ ہو جانا ہے، بھلانا نہیں۔

میں یہاں غائرؔ کے ان اشعار کا بطور خاص ذکر کروں گا جن میں زنجیر، دشت اور غبار جیسے الفاظ آئے ہیں۔ غائرؔ کے یہاں خیال کی ترسیل کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے ترسیل کا المیہ سے جوڑ کر دیکھا جائے۔ مگر یہ شاعری سادہ ہونے کے باوجود ذہن کو یک رخہ نہیں بناتی۔ غائرؔ نے ایک خاص ہنرمندی کے ساتھ خاموشی کو راہ دی ہے، ان کے یہاں خاموشی کا مطلب ایک معنی اور اس سے وابستہ کیفیات ہیں۔ غائرؔ نے معنی آفرینی یا معنوی طرفوں کی طرف توجہ کے بجائے اپنی شاعری پر توجہ صرف کی ہے، زیادہ کی ہوس شاعر کو اکثر اوقات خراب کرتی ہے، آپ کو غائرؔ کے یہاں منیرؔ نیازی کے جنگل کی وحشت نہیں ملے گی۔

کچھ دنوں دل میں کیا رہا وہ غزال
ساری وحشت یہیں پہ چھوڑ گیا

غزال سے نئے شاعروں کو دلچسپی ہے مگر انھیں معلوم نہیں کہ اسے غزل میں کس قدر باندھا جائے۔ غائرؔ کے مصرعے اتنے مربوط ہیں کہ اسلوب کی سطح پر رخنہ تلاش کرنا کارِ عبث

ہے۔ غائرؔ کا غزال اپنی خصوصیات میں نرالا نہیں، مگر چند دنوں کے قیام نے تمام عمر بھٹکنے کا سامان فراہم کر دیا۔ وحشت کو غزال کے ساتھ ہی جانا چاہیے تھا، اگر ایسا ہوتا تو اتنا خوبصورت شعر وجود میں نہ آتا۔

کاشفؔ حسین دشت میں جتنے بھی دن رہا
بیٹھا نہیں غبار مرے احترام میں

ایسا شعر کہنے کے لیے غبار کے تخلیقی سفر سے واقف ہونا ضروری ہے۔ غبار فطری طور پر بیٹھ جاتا ہے۔ دیوانے کی صحرانوردی غبار کو بیٹھنے نہیں دیتی۔ غبار کو یوں بھی اٹھنا تھا مگر کاشف حسین نے غبار کو کتنی عزت بخش دی ہے اس لیے کہ دیوانے کی صحرانوردی بھی قابل تعظیم ہے۔ اب غائرؔ کی زنجیر کو دیکھتے ہیں۔

اک صدا آتی ہے زنجیر سے گاہے گاہے
خود گرفتار ہے زنجیر بنانے والا

جو صدا زنجیر سے مسلسل آتی ہے وہ غائرؔ کی زنجیر کی صدا سے مختلف ہے، وقفے وقفے سے صدائے زنجیر بہت کچھ کہتی ہے، اس وقفے کو محسوس کرنا ہی تخلیقیت ہے، اسی صدا سے زنجیر بنانے والے کی گرفتاری کا سراغ مل سکا۔ کاشف حسین غائرؔ نے زنجیر کو جبر کے طور پر بھی دیکھا ہے۔

ایک نادیدہ سی زنجیر لیے پھرتی ہے
اپنی مرضی سے یہ انسان کہاں جاتا ہے

سرورالہدیٰ
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ہندوستان
(مطبوعہ ''ایک روزن'' اُردو ویب سائٹ سے اقتباس)